رشید احمد صدیقی کے خطبات

ڈاکٹر محمد رحمٰن، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ

Abstract

Rasheed Ahmed Siddiqui is also one of such great literary people who used to give effective lectures in educational institutes. These addresses are the best examples of indicating his critical thinking. Further these addresses show his deep love for study, knowledge, observation and experience. The total number of these addresses are seventeen. They are the great assets of the last stage of his life.

تعلیمی اداروں کے جلسہ تقسیم اسناد سے لے کر بڑے ادیبوں اور شاعروں کے یادگار جلسوں میں وقت کے نہایت ممتاز ادیب یا مفکر سے جو لیکچر دلوایا جاتا ہے خطبہ کہلاتا ہے۔ دورِ حاضر کی تعلیمی اور تہذیبی زندگی نے تحریر کی ایک شکل خطبے کو جنم دیا ہے۔ خطبے مختلف مواقع پر دیے جاتے ہیں۔ خطبہ دینے کا شرف ہر کس و ناکس کو حاصل نہیں ہوتا۔ خطبات کی صنف اردو ادب میں نئی ہے۔ برصغیر میں خطبہ دینے کی کوئی خاص روایت نہیں رہی ہے۔ البتہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کامیاب طلبہ اور طالبات کو جو اسناد عطا کی جاتی ہیں۔ اس موقع پر توسیعی لیکچر کی شکل میں خطبات دیئے جاتے ہیں۔ عموماً یہ خطبات کسی غیر معمولی شخصیت سے دلوائے جاتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی چونکہ ایک معروف ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ اس لیے وہ کئی مواقع اور موضوعات پر خطبہ دینے کے لیے بلائے گئے۔ ان کے قدردانوں میں علاّمہ اقبال جیسی عظیم شخصیت کا نام سرفہرست ہے۔ وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ملازمت کے دوران اور سبکدوش ہونے کے بعد طرح طرح کی تقاریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے بلائے جانے لگے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے علمی، ادبی اور ثقافتی اداروں نے انہیں خاص خاص تقاریب میں اپنی حیثیت میں اضافہ کرنے کے لیے دعوت دی۔ ایسے مواقع پر انہوں نے وزیروں اور سفیروں کی طرح رسمی خطبے نہیں دیے بلکہ ایسے خطبے دیئے جن میں ان کا علم، مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ، غور و فکر اور بصیرت نظر آتی ہے۔ انہوں نے یہ تمام خطبے پوری محنت سے لکھے اور اس طرح کہ ان میں ان کے منفرد اسلوب کی تمام خوبیاں اور دل آویزیاں جگمگا رہی ہیں۔ انہوں نے جو خطبات دیئے ان کی تعداد سترہ (۱۷) ہے

اور یہ ان کی زندگی کے آخری دور کا قابلِ قدر سرمایہ ہیں۔

ان خطبات کے مشمولات سے اگر چہ اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن رشید صاحب کی فکری عظمت سے انکار ممکن نہیں۔ ان خطبات کے مطالعہ سے اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ یہ ان کی فکری اور ادبی عظمت کا سنگ بنیاد ہیں اور ان کے بہترین اسلوب کے آئینہ دار بھی۔ یہ خطبات کسی عالم دماغ کی پیداوار نہیں بلکہ ان میں ان کی شخصیت اور بصیرت کے بہترین عناصر کی کارفرمائی ہے۔ ان خطبات میں ان کی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کا نچوڑ، ان کے علم وعرفان کے دلکش ٹکڑے، ان کے نقد ونظر کی لطافتیں، ان کے حسن و جمال اور جمال وفکر کے زاویے، ان کی پسند و ناپسند کی حدود، ان کے ردوقبول کے معیار یہ سب کچھ آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔

رشید صدیقی کے ادبی اسلحہ خانہ میں کم از کم دو آلات ضرب ایسے تھے جن کی مدد سے وہ خشک سے خشک موضوع کو دلچسپ اور دلچسپ سے دلچسپ موضوع کو گہری توجہ کا مستحق بنا سکتے تھے۔ ان دو آلات میں سے ایک تو ان کا مزاح ہے۔ دوسرا ان کا اسلوب۔ ''اصطلاحِ زبان ومصطلحات'' کتنا سنجیدہ اور خشک موضوع ہے۔ اسی موضوع پر رشید صاحب نے جولائی ۱۹۴۴ء میں کل ہند اردو کانفرنس حیدرآباد دکن کی صدارت کی۔ لیکن وہ اس موضوع سے نہ خود بور ہوئے، نہ سامعین کو بور ہونے دیا۔ پورا خطبہ شگفتگی اور شادابی کا ایک شاہکار معلوم ہوتا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو؛

> ''حضرات! بے موقع نہ ہوگا اگر میں یہاں بھی غرض کروں کہ مسلمان حکمرانوں بالخصوص مغلوں نے ہندوستان کے ساتھ جو کچھ اور جیسا کچھ سلوک کیا، اس سے قطع نظر انہوں نے ہندوستان کو تین ایسے نوادر بخشے ہیں جن کی مثال کچھ اور نہیں تو گذشتہ چند صدیوں میں نظر نہیں آتی، یعنی تاج محل، اردو اور غالب۔ معنوی اعتبار سے یہ تینوں ایک ہیں۔ ہندوستان کی سرزمین کے لیے ان سے بہتر اور حسین تر تاریخی تحفہ یادگار اور کیا ہو سکتی ہے۔ زبانوں کا وہ تاج محل یا تاج محلوں کی وہ زبان جسے اردو کہتے ہیں، آج جھگڑے کا گھر بن گئی ہے۔''(۱)

ایک علمی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اتنے خوبصورت خیالات اتنے دلکش انداز میں رشید صاحب ہی پیش کر سکتے تھے۔

رشید صدیقی کی اسلوبی حسن کاری میں صرف الفاظ وتراکیب کے فن کارانہ استعمال کو دخل نہیں بلکہ اس میں موضوع سے متعلق نکتہ رسی اور نکتہ سنجی کو بھی بڑا دخل ہے۔ ہندوستان میں رشید صاحب کے مقابلے میں ڈاکٹر رادھا کرشنن کو پیش کیا جا سکتا ہے جو انگریزی ادب کے بہترین نقاد تھے۔ ان دونوں ادیبوں کی نکتہ سنجیوں نے دونوں زبانوں کو مالا مال کیا۔(۲)

رشید صاحب نے خطبات میں مسلمان کے تہذیبی اور ثقافتی ورثے کی جتنی اور جیسی ترجمانی کی ہے اس

کی مثال اردو کی کسی کتاب میں نہیں مل سکتی ۔انہیں شعر یاد نہیں رہتے تھے لیکن ان کا حافظہ قومی واقعات اور معاملات کا مخزن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر خطبہ طویل ہے۔ اور بعض خطبے تو بہت ہی طویل ہیں۔ لیکن یہ طوالت گراں نہیں گزرتی ۔ان کے دوسرے مقالات سے قطع نظر ان کے خطبات اردو کے تنقیدی سرمائے میں نہایت اہم اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان خطبات کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ قدیم و جدید پر ان کی نظر کتنی گہری اور خیال انگیز تھی۔

رشید صدیقی کی اہم تحریر وہ خطبہ ہے جو انہوں نے یونیورسٹی میں پروفیسر کا عہدہ تفویض کیے جانے پر ''جدید غزل'' کے عنوان سے دیا۔ اس خطبے کے شروع ہی میں یہ جملہ ملتا ہے؛

''غزل کو میں اردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں۔''(۳)

یہ بیان اسی نوعیت کا ہے جس طرح ڈاکٹر عبدالرّحمان بجنوری نے اپنے مشہور مقدمے ''محاسنِ کلامِ غالب'' کے آغاز ہی میں کہا تھا؛

''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدس وید اور دیوانِ غالب۔''

یا جیسا کہ کلیم الدین احمد کے بارے میں فراق نے کہا تھا؛

''اس شخص کی آنکھیں آگے کی بجائے پیچھے کی طرف لگی ہوئی ہیں۔''(۴)

جس سے ان کی مراد موصوف کی بے بصری پر زور دینا تھا۔ عبدالرّحمان بجنوری اور رشید احمد صدیقی کے صاحب طرز ہونے میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں لیکن دونوں کے متذکرہ بیانات تاثراتی تنقید کے حامل ہیں۔

''جدید غزل'' میں اردو کے چار مسلّم الثبوت اساتذہ یعنی فانیؔ، جگرؔ، اصغرؔ اور حسرتؔ کے کارناموں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اور ان کے بعد فراق اور فیض پر۔ حسرت کے بارے میں ان کے خیالات یہ ہیں؛

> ''غالب کے بعد حسرت پہلے شاعر ہیں جن کو اردو غزل کا سب سے توانا اور صحت مند شاعر سمجھتا ہوں۔ حسرت کا جسم، جذبہ اور ذہن تینوں ایسے ہیں جو اپنی جگہ ثابت و سالم اور صحت مند ہیں۔ ان میں آپس میں کھینچ تانی نہیں ملتی۔ کسی میں تناؤ نہیں ہے۔ سب اپنی اپنی جگہ قابض اور متصرف ہیں۔۔۔۔ حسرت کا عشق، حسرت کی زبان، حسرت کا لہجہ، حسرت کی ساخت پرداخت سب کی سب منفرد ہیں، مرکب نہیں۔ وہ جڑی بوٹی کے قائل تھے ماءُاللحم اور کشتہ جات کے نہیں۔''(۵)

یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک طور سے مرکب نہ ہونا ہی ان کی شاعری کی محدودیت کی دلیل ہے۔ اسی طرح یہ رشید صدیقی کے یہ جملے؛

> ''تنقید نہ یزداں کا فن ہے نہ اہرمن کا۔ وہ انسان کا فن ہے اور انسان ادبی کے کارناموں کو پرکھنے میں دیانت، دانشمندی اور احترام سے کام لینا چاہئے نہ کہ نام ونفیر۔۔۔۔ میں شاعری میں تجربات کا قائل ہوں لیکن تجربات میں شاعری کا نہیں۔ میں تجربے کو تجربہ ہی سمجھتا ہوں، الہام نہیں۔''(۶)

بہت دل چسپ اور چٹخارے دار ہیں لیکن کوئی تنقیدی مناسبت یعنی Relevance نہیں رکھتے۔ وہ لفظوں کے الٹ پھیر سے کام لینے کا گُر خوب جانتے ہیں۔ لیکن تنقید کے عمل میں اس سے کام نہیں چلتا۔ اس طرح اصغر کے بارے میں انہوں نے یہ کہا ہے؛

> ''اصغر کے کلام میں ان کی عہد کی سرگرمیوں کے بڑے حسین اشارے ملتے ہیں۔ اصغر کے تخیل میں شائستہ رنگینی اور رنگین شائستگی ملتی ہے جس نے ان کے تاثرات کو دلاویز بنا دیا ہے۔ حسرت نے اپنی رعنائی کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ دراصل اصغر کے ہاں خیال کی رعنائی ہے اور حسرت کے ہاں جذبات کی رنگینی۔''(۷)

تخیّل میں شائستہ رنگینی اور رنگین شائستگی اور خیالات کی رعنائی اور جذبات کی رنگینی سے کسی واضح امتیاز کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح انہوں نے اقبال کی غزل گوئی پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔

''عزیزانِ ندوہ'' کے نام سے جو خطبہ رشید صدیقی نے دارالعلوم سلیمانیہ ہال ندوہ میں دیا وہ توسیعی خطبہ ہے جس کے مخاطب اوّل طلبا تھے۔ اسی لیے اس میں بہت سی باتیں طلباء اور نوجوانوں کے لیے کہی گئی ہیں۔ کیوں کہ قوم کے مستقبل کی امیدیں طلباء سے وابستہ ہوتی ہیں۔ دانش وبصیرت کو اس خطبے میں سمو دیا گیا ہے۔ ان کا خطاب عمومی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رشید صاحب صرف رفتارِ زمانہ کے نبض شناس ہی نہیں بلکہ معاملات کو دردمندی سے دیکھنے والے بھی ہیں۔ حالات کی ناسازگاری پر وہ دل سوزی محسوس کرتے ہیں اور پھر ان کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ بھی دلاتے ہیں۔ وہ طلبہ سے محبت کرتے ہیں۔ نوجوانوں کو عزیز رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کی بے راہ روی پر کڑھتے ہیں۔ ان کو متنبہ کرتے ہیں۔ زندگی کے نشیب وفراز سے آگاہ کرتے ہیں اور ان سے قبلہ درست رکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ خطبہ کا اصل مدعا طلباء کو زندگی کے ان عوامل اور اصولوں سے روشناس کروانا ہے جوان کو ایک بہتر اور مفید انسان بنا سکتے ہیں۔ یوں بھی ان کی تحریروں میں ہر جگہ ایک اخلاقی نقطۂ نظر کی کارفرمائی رہی ہے۔ ایک ایسا اخلاق جس کی بنیاد کسی حد تک اسلامی تعلیمات پر ہے اور بڑی حد تک علی گڑھ میں ابھرنے والی تہذیب۔ لیکن یہاں یہ مسائل براہ راست گفتگو کا موضوع ہیں۔ اس لیے نہ صرف یہ کہ ان پر تفصیل سے علمی بحث کی گئی ہے بلکہ ان کو معمول بنانے پر بھی زور دیا گیا ہے۔ تعلیمی ادارے تہذیب کے بھی گہوارے ہوتے ہیں۔ اس لیے اور اس لیے بھی کہ ایک تعلیمی ادارے کے طلبا مخاطبِ خاص ہیں۔ رشید صاحب نے ان تین عظیم درسگاہوں کا

ذکر کیا ہے جنھوں نے گذشتہ سو سال میں مسلمانوں کی علمی، ذہنی، فکری، تہذیبی، سیاسی اور اقتصادی زندگی کی تعمیر وتشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یعنی دارالعلوم دیوبند، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ندوۃ العلماء۔ ان اداروں کی عظمت، ان کی اہم خدمات اور ان کے اثرات کا فراخ دلی سے اعتراف کرنے کے باوجود مستقبل کے امکانات پر شبہات وخدشات کا اظہار کیا گیا ہے۔ کیا یہ ادارے جدید دور کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں؟ کیا ان کے فارعین زندگی میں اپنا مقام پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ کیا ان اداروں میں مستقبل کی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کی سکت ہے؟ انہی سوالات پر اظہار خیال کرتے ہوئے رشید صاحب نے جابجا ایسے جملے لکھے ہیں؛

''آج جس دورِ حیات سے ہم گزر رہے ہیں اس میں مذہبی تعلیم اس وقت مقبول اور مفید ہوگی جب اس سے ثواب کے علاوہ زندگی بہتر بنانے کے بھی مواقع حاصل ہوں۔۔۔۔ ہم کو ہرگز یہ توقع نہ رکھنی چاہیئے کہ ہمارے طلباء کا معیارِ زندگی تو کریما اور مامقیماں کا ہو لیکن کارنامے وہ انجام دیں رموزِ خودی اور رموزِ بےخودی کے۔''(۸)

یعنی اگر ایک طرف اس بات کی ضرورت ہے کہ دارالعلوم کے نصابات کی تجدید کرکے زمانہ حاضر کے علمی تقاضوں کی تکمیل کی جائے تو دوسری طرف یہ بھی ضروری ہے کہ ان تعلیمات کا کوئی رشتہ معاش واقتصاد کے ساتھ بھی قائم ہو۔ ان تعلیمات کا طلاق کم وبیش ندوہ پر بھی ہوتا ہے۔ لیکن شاید از راہِ تکلف (کہ یہ میزبان ادارہ تھا) ان کے راست اظہار سے اجتناب کیا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی نمائندگی وہ خود کر رہے ہیں۔ یہاں ان کے ذہن پر یہ بات حاوی رہی کہ مذہب کے تعلق سے سرسیّد اور علی گڑھ پر اعتراض ہوتے رہے ہیں۔ انہوں نے سرسیّد کی تفسیر اور ان کے ذہنی خیالات کو حق بجانب ثابت کرنے اور ان کی تاویل کرنے کی برابر کوشش کی ہے۔ انہوں نے اس ادارے کے مزاج اور قومی زندگی میں اس کی اہمیت کو ایک بلیغ جملے میں یوں ادا کر دیا ہے؛

''قومی زندگی میں جب کوئی مشکل مقام آئے گا ہم کو سرسیّد کے صحیفہ خدمات کی ورق گردانی کرنی پڑے گی اور سرسیّد کی خدمات کی سب سے کھلی ہوئی اور سب سے مستعد کتاب علی گڑھ ہے۔''(۹)

ان اداروں کے ذِکر سے ان کے درمیان کوئی مقابلہ کرنا نہیں ہے۔ بلکہ دردمندی کے ساتھ اس بات کا جائزہ لینا ہے کہ جن اداروں کی خدماتِ ذریں سے ہندوستان کے مسلمانوں کا ماضی تابناک رہا ہے۔ وہ مستقبل میں کس طرح مفید وموثر ثابت ہو سکتے ہیں۔ زندگی کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے لیے کس سمت میں سفر کرنے کی ضرورت ہے۔ ان امور کی طرف رشید احمد صدیقی نے بلیغ اشارے کیے ہیں۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ان اداروں میں علم وفن اور فکر ونظر کے اعلیٰ معیار کے ساتھ سیرت وشخصیت کی گرانمائیگی پر سب سے پہلے توجہ دینی چاہیئے۔ کیونکہ اسی سے ایک روشن مستقبل کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں؛

''جب تک سیاست یا لیڈرشپ اعلیٰ تعلیم گاہوں کے آزاد، آزمودہ کار، دردمند اور دلیر سربراہوں

کے ہاتھ میں رہے گی، ملک کے نوجوان کبھی بے راہ وروی کی طرف مائل نہ ہوں گے۔ جہاں طالب علم صحت مند ہے وہاں کا معاشرہ معتبر و مستحکم ہے۔ ایسے معاشرے سے ملک کی حکومت کا اعتبار قائم ہوتا ہے اور اس میں استحکام آتا ہے۔''(۱۰)

رشید احمد صدیقی تعلیم، مذہب اور اخلاق میں چولی دامن کا ساتھ سمجھتے ہیں اسی لیے وہ تعلیمی اداروں کی سیرت سازی کو بنیادی جگہ قرار دیتے ہیں۔ اس کے لیے وہ تعلیمات اسلامی سے اکتساب فیض کرنا چاہتے ہیں۔ زمانہ جدید کا ایک رجحان محض تہذیبی عوامل پر زور دینے کا ہے کہ اسی سے مذہب کو منسوب کر دیا جاتا ہے۔ گویا مذہب، عقائد و اعمال کا نام نہیں بلکہ ان چند خارجی مظاہر کا نام ہے جن پر کوئی خاص فرقہ کاربند ہو۔ اسی سے ایک نئی اصلاح ''تہذیبی مسلمان'' وجود میں آتی ہے۔ یہ اصطلاح ایسے لوگوں کے لیے استعمال کی جانے لگی ہے۔ جو ایک خاص خاندان میں پیدا ہونے کے باعث خاص قسم کے طرز رہائش، آداب نشست و برخاست، عادات خورد و نوش کے حامل ہوں۔ اعمال مذہبی سے تو ان کو کوئی سروکار رہوتا ہی نہیں۔ عقائد کے بارے میں بھی یہ لوگ آزادانہ روش رکھتے ہیں اور اسی انداز حیات کو مسلمانوں کے لیے کافی سمجھتے ہیں۔ وہ خود بھی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور حکومت کے رجسٹرڈ مردم شماری میں بھی ان کو مسلمان ہی لکھا جاتا ہے۔ رشید احمد صدیقی اسلام کے اس تصور کی مخالف کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں؛

''اسلام کی منزلت اس سے منسوب تہذیب و کلچر میں نہیں بلکہ اس کی تعلیم و ترتیب کے اصول بالغہ یعنی اس کے اوامر و نواہی سے متعین ہوتی ہے۔''(۱۱)

بعض صفحات میں انہوں نے سیرت و اخلاص پر بحث کی ہے۔ ان کے اس خیال کی بھی وضاحت نظر آتی ہیں۔ ان کا مذہب کا تصور محدود نہیں ہے۔ جو صرف چند ظاہر علامات یا افعال پر مبنی ہو بلکہ وہ مذہب کو ایک ایسی قوت تصور کرتے ہیں۔ جو انسان کے دروں میں صحت مند تبدیلیاں پیدکر دیتی ہیں۔ جو اس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو صالح انداز میں بیدار کرتی ہیں۔ جو اس کو نہ صرف اپنے لیے ایک عمدہ انسان بنا دیتی ہے بلکہ دوسروں کے لیے بھی مفید و فیض رساں بناتی ہے۔ اسی بحث سے چند جملے ملاحظہ ہوں؛

''جو عبادت خدمت خلق سے عاری ہو وہ عمر رائیگاں ہے۔۔۔۔ مذہب سے یہاں مراد وہ اعتقاد و عمل ہے جو ہم کو ادنیٰ اغراض کا بندہ نہیں اعلیٰ اقدار کا نمائندہ بنائے۔''(۱۲)

رشید احمد صدیقی نے نظم و ضبط کو بڑی اہمیت دی ہے کہ اسی سے انسانی صلاحیتیں بے راہ وروی سے بچتی ہیں۔ وہ ڈسپلن کو سیرت کی ''ماں'' کہتے ہیں۔ اسی لیے زندگی میں خاص طور پر طالب علموں کی زندگی میں اس کی کارفرمائی پر زور دیتے ہیں۔ جس شخص نے اپنی پوری زندگی طالب علموں کے درمیان گزاری ہو وہ بخوبی جانتا ہے کہ ڈسپلن کے فقدان سے کیسی بھیانک صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ پھر اس سے شخصیت و سیرت کس طرح مسخ ہو کر رہ

جاتی ہے۔ جس قوم کے نوجوانوں میں یہ کجیاں پیدا ہو جائیں اس کے مستقبل کا خدا ہی حافظ ہے۔ اپنے نوجوانوں کو اگر صحیح خطوط پر ڈھالنا ہے تو ان کو ڈسپلن کا پابند کرنا ہوگا۔

رشید صدیقی علی گڑھ کے پرستار اور علی گڑھ کی باتوں کے عاشق ہیں۔ کوئی بات ہو کہیں کا ذکر ہو، وہ بھٹک کر، راستہ بھول کر اپنے اسی محبوب موضوع پر آجاتے ہیں۔ حد یہ ہے کا انہیں زندگی میں کوئی اچھا آدمی نظر آیا ہے تو ان کے دل میں یہ خواہش ضرور پیدا ہوئی ہے کہ کاش یہ بھی ہم میں سے ہوتا۔ اللہ نے جہاں اسے اپنی نعمتوں سے نوازا یہ دولت اور فراوانی عطا فرمادی ہوتی۔ یعنی علی گڑھ کی اقامتی زندگی کا تجربہ۔ اس سلسلے کی دو کڑیاں ان کے دو خطبے ''علی گڑھ۔ ماضی وحال'' اور ''ایک خطبہ جو دیا نہ جاسکا'' ہیں۔ رشید صدیقی جب ملازمت سے سبکدوش ہو گئے تو گوشہ نشین ہو گئے۔ سبکدوشی کے بعد لوگ ملاقاتیوں کو ترستے ہیں۔ رشید صاحب نے اس منزل پر قدم رکھا تو اپنے گرد بہت مضبوط اور اونچا حصار کھینچ لیا۔ وہ اپنے مکان میں پوری طرح قلعہ بند ہو گئے۔ ان کا مکان ان کے لیے قلعہ تھا اور بھول بھلیوں کی حیثیت رکھتا تھا۔ علالت کے دوران مزاج پرسی کے لیے آنے والوں کو ایک ہی جواب ملتا تھا کہ ''اب اچھا ہوں، ملاقات کی چنداں ضرورت نہیں''(۱۳)۔ وہ جلسے جلوسوں اور تقریروں سے ہمیشہ دور رہتے تھے لیکن علی گڑھ اور علی گڑھ کے طلبہ سے ان کا عشق اس درجہ کا تھا کہ ۱۹۶۷ء میں جب یونیورسٹی کی جوبلی کے انتظامات شروع ہوئے تو بغیر کسی دعوت اور درخواست کے رشید صاحب نے چند ایک خطبات لکھے۔ پھر ڈاکٹر اصغر عباس کی نگرانی میں سرسیّد ہال ریویو (اولڈ بوائز نمبر) شائع ہوا تو رشید صاحب کا ایک خطبہ ''ایک خطبہ جو دیا نہ جاسکا'' کے عنوان سے شامل کر لیا گیا۔ اسی طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے متعلق ایک اہم دستاویز زمانے کی دست برد سے محفوظ ہوگئی۔ خطبے کا ایک حصّہ گزرے ہوئے زمانے کی یادوں پر مشتمل ہے۔ یہاں علی گڑھ کی وہ رعنائیاں نظر آتی ہیں جنہوں نے رشید صاحب کو ہمیشہ کے لیے اپنا گرویدہ بنالیا اور نہ جانے کتنے پہروں سے محبت کی ایسی بیڑیاں ڈال دیں کہ یہاں سے لوٹ کر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے علی گڑھ کی ان علمی مجلسوں کا خاص ذکر کیا ہے جنہوں نے علی گڑھ کے فرزندوں کی صلاحیتوں کو مالا مال کیا۔ ان انگریز اساتذہ کا احترام وادب کے ساتھ ذکر کیا ہے جنہوں نے اپنی زندگی اس کام کے لیے وقف کردی۔ بڑی محبت کے ساتھ علی گڑھ کے ان متوالوں کا ذکر کیا ہے۔ جن سے علی گڑھ برادری براہ راست واقف ہو یا بزرگوں سے صرف ان کا ذکر سنا ہو مگر ان کی یادوں کو ہمیشہ سینوں سے لگائے رکھے گی۔ انہوں نے بڑے فخر کے ساتھ ان ناموروں کے نام گنوائے ہیں جنہوں نے یونین ہال میں آکر طلبہ علی گڑھ سے محبت کا ثبوت دیا اور یونین نے ان پر پھولوں کی بارش کر کے ہمیشہ کے لیے ان کے دل جیت لیے۔ یونین کے ذکر کے ساتھ ان کا خیال ہے کہ صرف یہاں نہیں معیار ہر جگہ گرا ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں ہر جگہ بگاڑ ہے۔ لیکن لوگ بگڑ کر بھی جی سکتے ہیں۔ انہوں

نے مسلم یونیورسٹی کی اصلاح اور طلبا کی ترقی کے لیے بہت سی تجاویز پیش کر دی ہیں۔ ان سب کا تذکرہ تو مشکل ہے۔ لیکن چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے؛

''آپ اور یہ یونین ایسی یونینوں سے دور اور بہت دور رہیں جو یونیورسٹی طلبہ کی کہی جاتی ہیں لیکن ان کی سرگرمیاں اعلیٰ تعلیم گاہوں اور ان کے طالب علموں کے شایانِ شان نہیں ہوتیں۔ ایسی صورت میں کسی طرح گوارا نہیں ہوتا کہ یونین اور اس کے اراکین جن کا ریکارڈ اور روایات قابل فخر رہی ہیں، وہ باہر کے ایسے اداروں سے اتحاد خیال و عمل رکھیں۔ یہ آس پاس کی یونیورسٹی یونینوں کی روش اب ان روایات سے بیگانہ نظر آنے لگی۔ جو طالب علم کی زندگی کو بہتر بنانے میں معاون ہوتی تھیں۔ یہ مجالس اتحاد یا یونیورسٹیاں ایسی قوتوں کے قبضے میں چلی گئی ہیں جو طالب علم کو علمی، تعلیمی اور تہذیبی سرگرمیوں سے دور اور بیگانہ رکھتی ہیں۔'' (۱۴)

سیاست سے ہماری قوم کی وابستگی جذباتی زیادہ رہی ہے اور سوچی سمجھی کم، اور آزادی کے بعد سے تو ہمارے قافلے کو ایک سالار بھی میسر نہ آیا۔ رشید صدیقی قوم کے فرزندوں کی اصلاح پر زور دیتے ہیں کہ وہ دماغ سے زیادہ کام لیں اور دل سے کم۔ ان کے خیال میں طلباء کی بڑھتی ہوئی تعداد سے تعلیم کا عام معیار اور یونین کا نظم وضبط دونوں متاثر ہوئے۔ وہ یونین کی تجدید کا مشورہ دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں یونیورسٹی سے باہر کے عناصر یہاں کے ماحول میں کبھی کبھی زہر پھیلا دیتے ہیں۔ اس لیے ایسے عناصر سے محتاط رہنا چاہئے۔ اساتذہ اور طلبا کے درمیان رشتہ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کا سا نہیں رہتا تو طلبہ کو چاہئے کہ وہ آئندہ نسل کے لیے ابراہیمؑ بننے کی کوشش کریں۔ کیا پتا پھر کس کا امتحان مقصود ہوگا۔ ان کے سارے مشورے قبول نہ سہی لیکن ''ایک خطبہ جو دیا نہ جا سکا'' کے مطالعے سے اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ انہیں اس دانش گاہ اور اس کے نونہالوں سے کیسا قلبی لگاؤ تھا۔ ''علی گڑھ ماضی وحال'' میں انہوں نے سرسیّد کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا ہے، کا جس طرح قدیم یونان کا ذکر کرتے ہوئے پرکلیز اور اس کے عہد کو فراموش نہیں کی جا سکتا اسی طرح بیسوی صدی کے علی گڑھ کی تاریخ سرسیّد کی ذکر کے بغیر نامکمل ہوگی اور یہ کہ سرسیّد اپنے عہد کے اعتبار سے سب سے نمایاں ہیں۔ رشید صاحب نے سرسیّد کو ایک عظیم الشان تحریک کا بانی اور رہنما قرار دیا ہے۔ اس وجہ سے ان کی خدمات علی گڑھ کے فرزندوں کے لیے بھلانا آسان نہیں ہوگا۔ سرسیّد نے ہماری زندگی میں پیوست منفی اور مثبت عناصر کو قابو میں لانے کی کوشش کی جن کے عمل اور ردِعمل سے ہماری قوم متاثر ہو رہی تھی۔ انہوں سرسیّد کے زمانے میں مسلمانوں کی حالت زار کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی تہذیب میں ڈھل کر جوان ہوئی اور پھر اسی علی گڑھ کے ایم اے او کالج نے یونیورسٹی کا درجہ اختیار کیا اور ہزاروں فرزندان اسلام کو انہی لطافتوں سے فیض یاب کیا۔ علی گڑھ میں مختلف ادیان اور مختلف تہذیب کے لوگوں کے درمیان جو تہذیب قائم ہوئی ہے۔ اسے وہ علی گڑھ کا بڑا حصّہ اور

کارنامہ قرار دیتے ہیں۔ یہی اسی عقیدے کا اعلان تھا کہ اس نے ہندوستانی معاشرے میں ایک معتبر سوسائٹی کو جنم دیا۔ غالبؔ نے اردو نثر کو ترقی دی اور سرسیّد نے اسے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اس طرح اس کی خدمت کی کہ یہ ہندوستان کے مختلف عناصر کے درمیان ایک تہذیبی رشتے کا نشان بن گئی۔ سرسیّد نے مغرب کی سوسائٹی کی ترقی سے آئے ہوئے انقلاب کی وجہ سے پیدا ہونے والی بے چینی کو کم کیا اور مسلمان دل سے اسی ترقی کو قبول کرنے لگے۔ علی گڑھ میں یہ نظام سرسیّد نے متعارف کروایا۔ رشید صدیقی اردو کے مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اردو کی ترویج و ترقی کا مسئلہ سب سے اہم ہے۔ کیوں کہ اردو اور تہذیب ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لعل نہرو، نواب محمد اسماعیل، مولانا آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر رادھا کرشنن وغیرہ کا احترام ہم سب پر فرض ہے کہ انھوں نے علی گڑھ تہذیب کو مستحکم کرنے میں اپنا اپنا کردار خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ علی گڑھ کے ماضی و حال کے بارے میں وہ یہ سوچتے ہیں کہ یہ نمناک، کہر آلود اور سونی فضا ختم ہو رہی ہے ۔ الغرض ہمیں علی گڑھ کے لیے یہ سوچنا چاہئے کہ ہم علی گڑھ کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔

رشید صدیقی کا آخری اور اہم ترین خطبہ ''عزیزانِ علی گڑھ کے نام'' ہے۔ یہ خطبہ انھوں نے ۱۹۶۷ء میں شروع کیا تھا اور انتقال سے ایک دن پہلے ختم کر دیا تھا۔ اس خطبے کو ان کی تنقیدی مساعی میں اہم مقام حاصل ہے۔ یہ ان کا طویل ترین خطبہ ہے۔ جس میں وہ اپنی انشاء پردازی کی تمام قوتوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ اس خطبے کے ابتدا میں وہ کہتے ہیں کہ مجھ پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ پہلے مسخرگی اور مطربی کرتا تھا اور اب آخری عمر میں نصیحت شروع کر دی ہے۔ جس طرح بوڑھے آخری عمر میں کرتے ہیں۔ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ مجھ پر یہ الزام غلط ہے کیوں کہ آخری عمر میں آدمی پر سنجیدگی طاری ہونے لگتی ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ دہلی پر جو تباہی آئی اس تباہی نے علی گڑھ کو جنم دیا۔ اس طرح ایک تصور تو ختم ہو گیا لیکن علی گڑھ کی تعمیر ہوئی۔ علی گڑھ پہلے چھوٹا سا کالج تھا۔ لیکن مسلم ثقافت کی صحیح عکاسی اور اپنے ادبی خدمات کی وجہ سے اس کا مقام بڑا ہوا اور آخر کار طلبہ کی محنت سے اس نے مسلم یونیورسٹی کا درجہ اختیار کیا۔ یہ سرسیّد کی مساعی تھی کہ انھوں نے پہلے اس کالج میں انگریزی زبان کی حمایت کی لیکن بعد میں اردو کی حمایت سے بھی ہاتھ نہیں کھینچا۔ (۱۵) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک ماڈرن سوسائٹی پروان چڑھی لیکن اردو ادب کی جتنی خدمت اس ادارے نے کی اتنی شاید کسی اور ادارے نے کی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی آج ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیتی یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ مغلیہ دور کے بعد مسلم یونیورسٹی نے علم و ادب کی جتنی خدمت کی وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

''زبانِ اردو'' میں انھوں نے اردو کے مسئلے پر اظہار خیال کیا ہے کہ شاعری میں اقبال، حالی اور شبلی نے اردو زبان کی خدمت کی اور نثر میں سرسیّد، محسن الملک، سجاد حسین اور آزاد نے اپنی خدمات پیش کیں۔ یہ ادیب

اپنے زمانے کے صحیح مصوّر رہیں۔ سرسیّد نے اردو ادب کے لیے جو راستہ بتایا اور اس کی جو خدمت کی وہ کسی تعریف کی محتاج نہیں۔ مسلمانوں کی اپنی زبان تو عربی تھی یا فارسی، لیکن مسلم تہذیب وتمدّن کو ساری دنیا میں پھیلانے والی واحد زبان اردو ہے۔

''ہندوستانی اور اردو ایک ہیں'' میں رشید صدیقی نے اردو اور علی گڑھ کے ابدی رشتے کی اہمیت پر زور دیا ہے اور کہا ہے کہ اس درسگاہ میں ہر مذہب کے لوگ پڑھتے ہیں لیکن پھر بھی ان کے اندر ایک رشتہ ہے۔ وہ رشتہ اردو کا ہے۔ انہوں نے اردو کی حمایت پر زور دیا ہے۔ مسلمان اردو کے موجد نہیں بلکہ موئید ہیں۔ اسی طرح سنسکرت کے الفاظ ہندی میں ہیں اور ہندو اس سے عربی فارسی کے الفاظ نکالتے ہیں۔ اس سے اردو کی حمایت میں کمی آجائے گی۔ اردو اور ہندوستانی کی ترویج وترقی میں ہندو قوم کا بڑا حصّہ ہے۔ اس لیے انہیں اردو سے بدکنے اور بیزار ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ اردو سے محبت کرنی چاہیئے۔ کیوں کہ اردو کی وجہ سے ہندو اور مسلمان ان ٹوٹ رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں۔

رشید صدیقی نے ''ہماری زبان وادب کا اگلا قدم کیا ہو'' کے نام سے ایک خطبہ الاسلکی (حیدرآباد) میں دیا۔ اس خطبے میں وہ نوجوانوں کی صلاحیتوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نوجوانوں نے ادب کو ترقی دی ہے اور یہ بڑا امید افزا کارنامہ ہے۔

اردو ادب میں افسانہ اور نظم معرّیٰ میں جو تبدیلیاں ہوئیں اس سے اردو ادب میں نئے افق روشن ہوگئے ہیں۔ ڈرامے میں بھی مختلف قسم کے رجحانات فروغ پارہے ہیں۔ لیکن ڈرامہ ہمارے روایتی ماحول سے مطابقت نہیں رکھتا کہ ادب زندگی کے سامنے جوابدہ ہے۔ ہندوستانی سرزمین شعر وادب کا گہوارہ ہے۔ اردو میں تمام زبانوں سے زیادہ حوصلہ ہے۔ اردو کے مختلف ناموں کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہر آدمی اس پر اپنا حق سمجھ رہا ہے اور اس طرح اردو سے محبت کا ثبوت دے رہا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے لے کر پنڈت جواہر العل نہرو تک سب اردو کی محبت کے گیت گاتے رہے ہیں۔ اردو اور ہندی کا رشتہ بھی ایک ہی ہے کیوں کہ دونوں نے ساتھ ہی جنم لیا اور ساتھ پلی بڑھیں۔ یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ اردو نے مسلم مذہب واخلاق کی ترویج وترقی میں بڑا حصّہ ادا کیا ہے۔ رشید صدیقی اردو غزل کے بارے میں کہتے ہیں کہ حسرت، اصغر، اور جگر نے اردو غزل کی آبیاری کی۔ اردو گلیوں اور بازاروں میں جوان ہوئی اور عوامی زندگی سے ابھری۔

رشید احمد صدیقی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ''خطبہ جلسۂ تقسیم اسناد'' کے نام سے خطبہ میں تعلیم کی اہمیت اور افادیت پر دیا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے انسانیت کی بہت خدمت کی ہے اور اس ضمن میں علی گڑھ کی گرانقدر خدمات سے انکار ممکن نہیں۔ اس میں نئے تجربے، نئی ہیت، نئے موضوع، نیا لب ولہجہ اور نئ

فضا سے رشید صاحب کو بد گمانی نہیں بلکہ وہ حالات کے مطابق پھونک پھونک کر قدم رکھنے کو بہتر سمجھتے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خدمات پر بھی انہوں نے روشنی ڈالی ہے۔اس کے لیے جو حالات پیدا کیے گئے تھے وہ ٹھیک نہیں تھے لیکن ساری عمر ذمّہ داری کا احساس انسان کی صلاحیتوں میں بہتری پیدا کرتا ہے۔

رشید صدیقی نے ''اردو رسم الخط'' کے نام سے افتتاحی خطبہ دہلی یونیورسٹی میں دیا۔اس خطبہ میں انہوں نے مختلف رسوم خط جیسے نسخ، نستعلیق، ریحان اور ثلث وغیرہ پر بحث کی ہے اور ہر ایک کی اہمیت واضح کر دی ہے۔ ہندوستان کے آئین میں ہندی کو قومی زبان قرار دیا گیا اور دیوناگری رسم الخط کو رائج کرنے کی سفارش کی گئی ہے ۔اب ہندو اردو کو بھی اسی رسم الخط میں لکھنے کے لیے زور لگا رہے ہیں لیکن اردو مسلمانوں کی صدیوں کی میراث ہے اور اسے عربی رسم الخط میں ہی رہنا چاہئے کیوں کہ عربی مسلمانوں کی زبان ہے۔یہی وجہ ہے کہ مسلمان عربی رسم الخط سے محبت رکھتے ہیں اور اسے پسند کرتے ہیں ۔اردو رسم الخط عربی میں نہ ہو کہ دیوناگری رسم الخط میں ۔رشید صدیقی نے اردو اور علی گڑھ کو لازم وملزوم قرار دیا ہے کیوں کہ جب دلّی اجڑ رہی تھی تو اس کا نتیجہ علی گڑھ کی صوت میں رونما ہوا جو مسلمانوں کی تہذیب وتمدّن کا امین بنا۔جس کا سب سے بڑا کارنامہ ہندوستان میں لسانی اتحاد، جغرافیائی وحدت اور تہذیب وتمدّن کے رشتے میں ہندوستانیوں پر زور دینا تھا۔اس کی سب سے بڑی وجہ اردو زبان کا نفوذ ونشو وَنما ہے ۔علی گڑھ نے اردو کی حمایت کی اور اردو کا نشاۃ ثانیہ علی گڑھ میں طلوع ہوا۔ اردو کا مولد ومسکن دہلی اور مرکز ثقل مجموعی طور پر اتر پردیش رہا ہے ۔ انگریزوں نے اردو کو ماڈرن اور معیاری بنایا اور اسے ثقیل ہونے سے بچایا۔

خطبات نگاری رشید احمد صدیقی کا ایک ایسا میدان ہے جس میں ان کی عظمت جھلک نہیں رہی، چھلک رہی ہے۔ یہ خطبات فکر ونظر کے اعتبار سے ان کا بڑا کارنامہ ہیں۔ یہ خطبات انہوں نے بڑی محنت سے لکھے اور ان کی عظمت کا یہ پہلو انہیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔وہ اردو ادب کی اس دیو پیکر نسل سے تعلق رکھتے ہیں جن کے اکثر لکھنے والے صاحبِ اسلوب ادیب تھے۔ان کے اردگرد صاحبِ اسلوب ادیبوں میں مہدی آفادی، سجاد انصاری، خواجہ حسن نظامی، مولانا مودودی، مسعود حسن رضوی ادیب، قاضی عبدالغفار، پطرس بخاری، شوکت تھانوی اور مولانا صلاح الدین احمد جیسے ادیب شامل تھے۔لیکن ان میں کوئی بھی اس میدان میں طبع آزمائی نہ کر سکا کیوں کہ خطبہ کے لیے بڑی علمی بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے ۔ادیب اور شاعر کا مقابلہ صرف اپنے معاصرین سے نہیں ہوتا بلکہ اس کا مقابلہ ماضی، حال اور مستقبل تینوں سے ہوتا ہے ۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خطبات نگاری میں رشید صدیقی کا پایہ مزاح نگاری اور خاکہ نگاری سے بھی زیادہ ہے کیوں کہ وہ اردو ادب کے واحد مصنف ہیں جنہوں نے خطبات میں نام پیدا کیا اور اس طرح اردو ادب کی اس نو آموز صنف کو وہ طاقت

اور توانائی دی جس کا مقابلہ دورِ حاضر تک کوئی نہ کر سکا۔

رشید احمد صدیقی کے خطبات چونکہ ان کی آخری عمر کا کارنامہ ہیں اس لیے ان میں ان کے پختہ شعور کا پہلی بار اظہار ہوا ہے۔ ان خطبات میں انہوں نے پہلی مرتبہ اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ ان کے خیالات بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ یہ رشید صدیقی کی آخری عمر کی تحریریں ہیں جن میں مسلسل مضامین ہوتے ہیں۔ ان مضامین میں وہ انسان کو اعلیٰ ترین پیکر میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس دور میں وہ جس ذہنی ساخت کے حامل ہو چکے تھے وہ ان کے طویل خطبات میں منعکس ہو رہا ہے۔ اور ہر موضوع میں ان کی بنیادی فکر زیریں رو کی طرح جاری و ساری رہتی ہیں۔ الغرض رشید احمد صدیقی نے تنقید کو اپنا پیشہ نہیں بنایا لیکن ان کی باقیات میں جو تنقیدی خطبات ملتے ہیں ان کا اعتراف کیا جانا چاہیے کہ انہوں نے بہت سے سکہّ بند نقادوں کے مقابلے میں اچھا لکھا ہے۔ اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

حوالہ جات:

۱۔ رشید احمد صدیقی، ''خطبات''، مرتّبہ لطیف الزمان، مہر الٰہی ندیم، (کراچی: مکتبہ دانیال، بار اوّل ۱۹۹۱ء)، ص ۱۴۶

۲۔ نظیر صدیقی، پروفیسر، ''رشید احمد صدیقی کے خطبات''، مشمولہ ''ادبی جائزے'' از مصنف، (لاہور: الوقار پبلشرز، ۱۹۹۵ء)، ص ۴۴

۳۔ رشید احمد صدیقی، کتاب مذکور، ص ۲۰۹

۴۔ گیان چند، ڈاکٹر، ''فراق سے ملاقاتیں''، مشمولہ ''اردو ادب۔ فراق نمبر ۸۴۔۱۹۸۳ء''، (لاہور: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۹۰ء)، ص ۵۸

۵۔ رشید احمد صدیقی، کتاب مذکور، ص ۲۱۵، ۲۳۶

۶۔ اسلوب احمد انصاری، ''اطراف رشید احمد صدیقی''، (کراچی: مجلس ترقی اُردو، ۱۹۹۹ء)، ص ۱۲۳

۷۔ اصغر عباس، مرتّب ''رشید احمد صدیقی آثار و اقدار''، (شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۸۴ء)، ص ۳۵۳

۸۔ رشید احمد صدیقی، کتاب مذکور۔ ص ۲۸۰، ۳۲۰

۹۔ ایضاً، ص ۳۲۲

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۰۲

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۰۰
۱۲۔ اصغر عباس، کتاب مذکور، ص ۳۳۳
۱۳۔ ایضاً، ۳۵۶
۱۴۔ رشید احمد صدیقی، کتاب مذکور، ص ۵۵۸
۱۵۔ ایضاً، ص ۵۶۰

مآخذ:

۱۔ اسلوب احمد انصاری، ''اطراف رشید احمد صدیقی''، کراچی: مجلس ترقی اُردو، ۱۹۹۹ء۔
۲۔ اصغر عباس، مرتّب ''رشید احمد صدیقی آثار واقدار''، شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۸۴ء۔
۳۔ رشید احمد صدیقی، ''خطبات''، مرتّبہ لطیف الزمان، مہر الٰہی ندیم، کراچی: مکتبہ دانیال، بار اوّل ۱۹۹۱ء۔
۴۔ گیان چند، ڈاکٹر، ''فراق سے ملاقاتیں''، مشمولہ ''اردو ادب۔ فراق نمبر ۸۴۔۱۹۸۳ء''، لاہور: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۹۰ء۔
۵۔ نظیر صدیقی، پروفیسر، ''رشید احمد صدیقی کے خطبات''، مشمولہ ''ادبی جائزے'' از مصنف، لاہور: الوقار پبلشرز، ۱۹۹۵ء۔

☆☆☆